

گناہ کا صحرا

مُصَحَّف اقبالِ توصیفی

گُہاں کا صَحْرَا

Acc. No.
681

© جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

891.4391
MUS

بارِ اول، دسمبر ۱۹۹۳ء
تعداد: پانچ سو
قیمت: اسی (۸۰/-) روپے
کتابت: محمد غالب
محمد سلیم
طباعت: اسپید پرنٹس، سعید آباد۔ حیدر آباد

معاونت: اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش۔ حیدر آباد

- ملنے کے پتے: • مکتبہ شروعت ۲/۲۵۹-۳-۶ کپاڈی لین، سوماچی گورڈ۔ حیدر آباد-۲-۵۰۰۰۰۰
• اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش، اے۔سی۔ گارڈز۔ حیدر آباد-۲-۵۰۰۰۰۰
• مصنف، ۲۰۴ مغل اسٹ اپارٹمنٹس، مہدی پٹنم۔ حیدر آباد-۲۸-۵۰۰۰۰۰

A. No.

681

اپنے دادا

جناب محمد عبد الباسط صدیقی مرحوم

کے نام

ترتیب : ۲

عطیہ اقبال

ترتیب :

نوید اقبال

دیا اقبال

فہرست

پیش لفظ، ۱۱

یہ کیسا شہر ہے، ۱۵

مجھے صدا دے، ۱۶

چشم بے خواب میں ہے رات کا ڈر، ۱۸

مجھے ڈر ہے تری راتیں کہیں پہچان لیں مجھ کو، ۲۰

میں ریزہ ریزہ بکھر جاؤں گا سنبھال مجھے، ۲۱

دل نہ مانے گا سمجھائیں گے ہم بہت، ۲۲

سفید تحریر، ۲۳

شکوہ، ۲۵

ایک گھر، ۲۷

محفلوں میں کم نظر آتا ہوں میں، ۲۹

راتوں کو سرہانے مجھے آنے نہیں دیتا، ۳۰

وقت کو کس نے روکا، ۳۱

اس پھول کو زلف میں سجا کر، ۳۲

عکس کی کرچی، ۳۳

ادھوری ملاقات، ۳۵

بمبئی کی ایک رات، ۳۶

تو خاموش تھی، ۳۸

جھلک دیکھی تھی ساحل پر لپٹتے بادبانوں کی، ۳۹

جزیروں کے سلسلے، ۴۰

میں اور تم، ۴۲

میرا دشمن، ۴۴

ایک نظم، ۴۵

صفر، ۴۷

نفس نفس یہ صلیبیں قدم قدم بن باس، ۴۹

سفر کا آخری نشان سُرخ ہے، ۵۰

نہیں، ۵۱

کچی قبروں کے سرہانے ڈھونڈوں، ۵۳

رقص، ۵۴

ایک چہرہ سراب دیکھوں گا، ۵۶

وہ پاؤں ہی نہ رکھتا تھا کہیں پر، ۵۷

کیا کروں میں بھی اٹھالوں پتھر، ۵۸

اڑتے پنچھی کی طرح تو ہوتا، ۶۰

آنکھیں بند ہیں اور لب ساکت، کونے میں جو بیٹھا ہے، ۶۲

آئیے اور دیواریں، ۶۳

شبِ یلدا، ۶۴

دیکھو گھروں کی تیرگی سڑکوں پہ آگئی، ۶۶

رُت جانی پہچانی بھج، ۶۷

بھاری پتھر، ۶۸

دیکھا تجھے تو کوئی شکایت نہیں رہی، ۷۰

تو اپنے اشکوں کے سارے گہر مجھے دے دے، ۷۱

دروازے تک آئیں، ۷۲

واپسی، ۷۴

وہ لوگ، ۷۶

دھیان تیرا، من تیرا، ۷۷

تجھ کو شہر میں، بن میں ڈھونڈا ہار گئے، ۷۸

ایک نظم، ۷۹

ہر آئینے میں خدو خال اس کے، ۸۱

تخلیق، ۸۲

پل کے نیچے، ۸۳

دکھ کو گلے کا ہار بنایا کس نے... تم نے، ۸۴

دستک، ۸۵

بیروت، ۸۷

اپنے گھر میں بیٹھا ہوں، ۸۸

شاذ تمکنت کی یاد میں، ۹۰

اے مری شبِ رفتہ، ۹۲

ایک نظم، ۹۵

نقشِ پا منزلِ غبار میں ہے، ۹۷

تاریک ستارہ، ۹۸

فساد، ۱۰۰

کھیل، ۱۰۲

قفس میں جی نہیں لگتا تو یہ بھی کر دیکھے، ۱۰۳

نیم دائرے، ۱۰۴

میں نے تجھ کو کھولا تھا، ۱۰۶

بے نام، ۱۰۸

وہ تری ہمسائیگی تھی، میں نہ تھا، ۱۰۹

اسکوٹر پر جاتے ہو، ۱۱۱

پیش لفظ

زیر نظر کتاب، میرا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔

میں اپنے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آتا، بات کہاں سے شروع کروں؟ زندگی،
خلہ میں گھومتے ہوئے ایک نقطے کی طرح ہے، ایک جلتا بجھتا ستارہ، یہ نقطہ، یہ وقفہ اس قدر مختصر ہے کہ
اسے طویل دینے کی ساری کوششیں بڑی عجیب لگتی ہیں، اور اگر کسی صورت ہم اس وقفہ کو طویل بھی
کریں تو کس قدر؟ میں کبھی ایک لمحے کو ایک صدی مان کر اسے دہائیوں، مہینوں، دنوں اور لمحوں میں
بانٹا ہوں پھر ان لمحوں کو جوڑتا ہوں، صدی بناتا ہوں، پھر توڑتا ہوں۔ یہ عمل آوازوں اور پچھائیوں
کو بھارتا ہے، کبھی میں خوف سے انہیں دیکھتا اور سُنتا ہوں، کبھی چشم و گوش کے دروازوں پر ان کی
دستک میرے جسم و روح کو بیدار کرتی ہے۔ شاہراہوں پر ٹریفک کا شور، شفق کی سُرخ، جانے انجانے
چہرے، پیٹے ہوئے دنوں کی باسی مہک، یہ سب کیا ہے؟ صرف ایک نقطہ، ایک کوششِ ناتواں، گزرتے
ہوئے وقت کو روکنے کی، لیکن وقت کو کس نے روکا؟ پھر میں دیکھتا ہوں کہ آسمان پر وہ نقطہ جوئیں ہوں

تنہا نہیں۔ ایسے ہزاروں نقطے ہیں جو مل کر وقت کی ایک لکیر بن گئے ہیں۔

اس مجموعے کی نفلیں، غزلیں زندگی کے کئی رخ اور اُن کے جذباتی، فکری اور احساساتی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ میرے گرد زندگی کا پھیلا ہوا بے معنی اور بے روح گورکھ دھندا، انخبا روں کی جلی سُرخیاں جن کا میری روح میں بپا کہرام سے کوئی علاقہ نہیں، لیکن کچھ چھوٹی بڑی باتیں جیسے بکھاری کا زلزلہ، میری بیٹی کی مسکراہٹ، مجھے اس طرح جھنجھوڑتی ہے کہ میں اچانک تاریکی سے روشنی میں اُجاتا ہوں۔ دکھ، سُکھ، ہجر، وصل، انسانی رشتوں کے جھوٹ، اپنی ذات کی کجی۔ ماری شکلیں صاف دکھائی دینے لگتی ہیں۔ یہ اور اس طرح کی کئی باتیں، ان نظموں کو پڑھنے کے بعد اگر آپ کو بھی محسوس ہو سکیں تو میں سمجھوں گا کہ میری یہ کوشش رائگاں نہیں گئی۔

میں ڈاکٹر معنی تیسیم، جناب علی ظہیر، جناب خالد قادری، جناب راشد آزاد اور جناب مظہر مہدی کا تہہ دل سے ممنون ہوں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت کے مختلف مراحل میں میری مدد فرمائی۔ میں اپنے دوست، عزیز آرٹسٹ کا بھی شکر گزار ہوں جن کا بنایا ہوا سرورق، اس کتاب کی زینت ہے۔

مصحف اقبال تو صیفی

خاکِ آدم ہی ہے تمام زمیں

پاؤں کو ہم سنبھال رکھتے ہیں

(میر)

یہ کیسا شہر ہے

یہ کیسا شہر ہے۔ سڑکوں کے اس سمندر میں
 نشانِ ریگ، نہ ساحل، نہ صورتِ انساں
 ابھرتی ڈوبتی پرچھائیوں کا سیلِ رواں
 پلک جھپکتی ہوئی آسماں کو تکتی ہوئی
 دُعا کو ہاتھ اٹھائے نیاں روشنیاں
 ادھر وہ موڑ پہ اک بھیڑ سی دوکانوں کی
 وہ پانیوں پہ جھکی کھڑکیاں مکاتوں کی
 یہ کہہ رہی ہیں "یہاں بھی مکیں نہیں کوئی"
 ہمارے سینوں میں لاوا ہے کھولتا لاوا
 ہمارے پاؤں کے نیچے زمیں نہیں کوئی!!

مجھے صدا دے

مجھے صدا دے
 کبھی مجھے اتنی دُور سے صدا دے
 کہ تیری آواز کے تعاقب میں گھر سے نکلوں
 تو جنگلوں، وادیوں، پہاڑوں کا کارواں میرے ساتھ نکلے
 ہزار سمتوں کے ہاتھ میں ساعتوں کے نیزے
 جو میری آنکھوں میں بازوؤں میں گڑے ہوئے ہیں
 ٹول کراپنے جسم آنکھوں سے ایک ایک نیزہ نکال دوں میں
 دہکتے سورج کی سرخ بھٹی میں ڈال دوں میں

کبھی مجھے اتنی پاس سے صدا دے
 کہ تیری آواز مجھ میں پیدا ہو

مجھ سے ٹکرائے، مجھ میں لوٹے
 میں تیری آواز کے جزیرے میں قید ہو جاؤں
 کبھی میں تجھ کو ہی قید کر لوں
 ترے سمندر کو
 اپنے پیاسے بدن میں بھر لوں !!

غزل

پچشم نے خواب میں ہے رات کا ڈر
زخم کا اک نشان چہرے پر

کچھ بھرم رکھ مری محبت ۔۔ کا
دیکھ ۔ اک غم کو بے لباس نہ کر

جھوٹ ہی کہہ کے میرا دل رکھ لے
مجھ کو برباد کر، ادا اس نہ کر

ایک کونے میں جا کے بیٹھ گیا
شام سے بوجھ تھا بہت دل پر

تیری محفل سے اپنی خلوت سے
میں چلا جاؤں گا ابھی ۔ اٹھ کر

اب تو پاؤں بھی میرے دُکھنے لگے
ختم ہو جائے عمر کا یہ سفر

تیری زلفوں کے ختم اکیلے تھے
انگلیاں تھیں مری اُداس ادھر

زیست کرنے کا فن — تجھ آیا
دل کو میں خوں کروں — یہ میرا ٹھنڈ

شاعر اچھا نہیں۔ بُرا بھی نہیں
ذکر مصحف کا اس طرح تو نہ کر

غزل

مجھے ڈر ہے تری راتیں کہیں پہچان لیں مجھ کو
نہانے خواب کی شمعیں جلانے میں نہ آؤں گا

مرا اک غم ہے اُس کی پائنتی بیٹھا رہوں گا میں
میں گھر ہی سے نہ نکلوں گا۔ میں دفتر بھی نہ جاؤں گا

سہارا دو۔ اگر اس پیر کی چھاؤں میں بٹلا دو
اب ایسا لگ رہا ہے میں زیادہ چل نہ پاؤں گا

اگر سورج سے اتنی دُور۔ اتنی دُور ہو جاؤں
تو میں شام و سحر کے دائرے میں بھی نہ آؤں گا

بھلا بتلائیے ان کے تجسس کی کوئی حد ہے
یہ میرا راز ہے، تم کون ہو، میں کیوں بتاؤں گا؟

غزل

میں ریتہ ریتہ بکھر جاؤں گا، سنبھال مجھے
نگاہ سے نہ گراؤ دل سے مت نکال مجھے

میں بے ادب کوئی ٹیڑھا سوال کر بیٹھوں
تو اپنی جُود و سخا کے کنویں میں ڈال مجھے

نگاہ تو نے جھکالی تو چپ رہا ورنہ
ابھی تو کرنے تھے تجھ سے کئی سوال مجھے

وہ آندھی آئی۔ وہ اک غنیمت کا کواڑ گرا
یہ کیسے خواب میں آنے لگے خیال مجھے

بھی زمیں، مری دوزخ ہے، میری جنت بھی
میں تھک گیا ہوں بہت، حشر پر نہ ٹال مجھے

غزل

دل نہ مانے گا سمجھائیں گے ہم بہت
جاتے ہیں کچھ آئیں گے ہم بہت

ہم کو تنہا ہی رہنے دے اب مان جا
تیری محفل میں گھیرائیں گے ہم بہت

کل یہ صحرائے جاں راہ ہو جائے گا
آگ میں اپنی جل جائیں گے ہم بہت

اب جو بچھڑے نہ دیکھو گی زندہ نہیں
اب جو لوٹے بکھر جائیں گے ہم بہت

کس کی آواز کانوں میں آنے لگی
کون کہتا تھا "یاد آئیں گے ہم بہت"

سفید تحریر

اُد

بچپن کی اُن سنہری وادیوں میں چلیں
 شاید وہاں میرے خوب صورت بھیّا مل جائیں
 دو ننھے ننھے قدموں کے نشان گھاس پر موجود ہوں
 ایک رومال۔

جس پر ٹیڑھے میڑھے حروف میں پنسل سے میں نے اپنا
 نام لکھا تھا

اور باجی نے سُرخ اور نیلے ریشم سے کاڑھا تھا

باجی۔ جو اب ہزاروں میل دور ہیں
 سنا ہے اُن کے بالوں میں ایک سفید تحریر آگئی ہے
 تو اُن سے کہیں۔ ”باجی! ایسا ہی ڈھیروں سفید ریشم ہمیں بھی لے دیجیے
 سرخ اور نیلے رنگ تو کہیں کھو گئے“

سفید رنگ جسے زندگی کے ساتوں رنگ درکار ہیں
 شاید کم یا ب ہے
 میرے ذہن میں ایک تصویر بنتی ہے
 ڈبو مجھ سے بھی بڑا ہو گیا ہے
 ہر طرف سکون ہے
 اور خاموشی —

”یہ آپ کیا سوچ رہے ہیں“
 وہ اچانک آجاتی ہے
 اور میں اس کے ہاتھ ہاتھوں میں لے کر
 ہنسنے لگتا ہوں !!

شکوہ

آسمانوں کے پیچھے
 میرے خلاف ایک گہری سازش ہوئی
 گنتی کی سانسیں لیے
 جب میں زمین پر آیا
 تو میرے سینے میں ہزاروں گہری خندیں اور کھائیاں تھیں
 میرے ذہن کے دروازے تک
 اُن گنت سرملکیں اور انھیں کاٹتے ہوئے کچے راستے آتے تھے
 اور کسی نے پہلے ہی اس زمین کو ایک انگلی پر گھما کر زور سے سورج کی طرف
 اُچھال دیا تھا
 زمین گھوم رہی تھی۔

اپنے محور پر
سورج کے گرد

اور وہ سارے سوال جو میں نے اپنے بارے میں پوچھنا چاہے تھے
میری سانسوں سے لپٹے ہوئے ان ختم رقوں کھائیوں اور پگڈنڈیوں پر
بکھر گئے تھے

میں نے اپنی کراہ سنی
کوئی میری سانسوں پر
بھاری قدموں سے چل رہا تھا —

جنگل کی ہوا کتنی سفاک ہے
اور رات — تاریک
میرے سوالوں کا جواب کہیں نہیں

میں نے تمہاری عبادت کی ہے
تم کچھ بولتے کیوں نہیں
تم جو خدا ہو!!

ایک گھر

ہماری ملاقات جسموں سے شروع ہوئی
 پھر ہم نے جسموں کے آگے بہت سی باتیں دریافت کیں
 دھڑکھ کی بستی میں
 ایک چھوٹا سا گھر بنایا
 ناریل کے درختوں کے درمیان
 مغربی ساحل پر —

تم جو مجھے اتنا چاہتی ہو
 یہ کیسی خواہش ہے
 کہ میں شیشے کی طرح نازک بن جاؤں

ڈرائنگ روم کا ایک کونہ —
 شیشے کی دیواروں میں
 پانی کی سطح کا ٹپتی ہوئی
 رنگ برنگی مچھلیاں
 اور تم مسکراتے ہوئے۔ اُننگی اٹھا کر لوگوں سے کہہ سکو
 وہ ادھر یہ دیکھیے
 (میری نیکیاں، میری خوبیاں)

نہیں — نہیں —
 اں جو نہ شیشہ ہوں نہ پتھر
 میں تو زلزلوں کے ڈر سے
 زمین کی خفیف سی لرزش پر
 تمہیں شانے سے پکڑ کر
 آسمان کے نیچے لے آتا ہوں
 اں چاہتا ہوں آسمانوں ہی میں رہوں
 اس گھر کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے کر بلند ہو جاؤں
 بہت بلند —
 مگر یہ کیسے ممکن ہے !!؟

غزل

محفلوں میں کلم سر آتا ہوں میں
اپنی تنہائی سے گھبراتا ہوں میں

تیرا آنسو ہوں، تو پلکوں میں چھپا
اک تماشا سا بنا جاتا ہوں میں

”گھر میں بس یلو ہے بیٹی اور میں“
کس سنے کے لیے آتا ہوں میں؟

اس مجھم آرزو کے درمیاں
کس قدر تنہا نظر آتا ہوں میں

میرے خدو خال لوٹا دوا بھی
آئینے پر سنگ برساتا ہوں میں

غزل

راتوں کو سر ہانے مجھے آنے نہیں دیتا
خوابوں کو ذرا ہاتھ لگانے نہیں دیتا

آنکھوں میں ہیں اک خوفِ دہ خواب کی چپٹیں
میں رات کے بلبے کو ہٹانے نہیں دیتا

اک شخص تھا ' میں بھول گیا شکل تک اس کی
اک غم ہے اسے پاس بھی آنے نہیں دیتا

میں تو وہی لکھوں گا مرے جی میں جو آئے
ہر شعر پہ تو مجھ کو خزانے نہیں دیتا

وقت کو کس نے روکا

مجھ سے جانے کتنی باتیں کرنی تھیں
تیرے بالوں کی اک لٹ کو
تیرے ہونٹوں پھر اپنے ہونٹوں تک لانا تھا
تیرے سر ہانے

ان دیکھے خوابوں کی قطاریں
تیری آنکھوں کے ساگر میں غیندوں کی کشتی
میں تیرا مانجھی۔

کتنے دیپوں کا یہ سفر جو نیا، انوکھا، انجانا تھا
لیکن صبح کی کرنوں کے طوفاں کا کوئی ٹھکانہ تھا
وقت کو کس نے روکا۔ وقت کو آخر جانا تھا!!

غزل

اس پھول کو زُلف میں سجا کر
خوش بو کا سفر مجھے عطا کر

آنکھوں میں اُگا دے کوئی منظر
اک خواب ہی زہر میں بجا کر

یہ آئینہ خانہ کیا کروں میں
میں تجھ کو کہاں رکھوں چھپا کر

یہ ہونٹ مری جہیں پہ رکھ دے
میں بھول سکوں تجھے، دُعا کر

یا دوں نے کہا "یہیں یہ بیٹھیں
اخبار زمین پر بچھا کر

عکس

جب میں اپنے تنگ و تاریک گھ
تو میں نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں

نفرت - عریاں
(تم نے نہیں دیکھی ہوگی)

اس کا سرد اور خاردار بدن
کہ اگر چھولو تو سارا جسم نیلا پڑ جائے۔
دیکھو تو آنکھوں میں اپنے ہی عکس

قطرہ قطرہ
آنسو بن کر بہیں
آنکھوں میں کوئی منظر نہ رہے

درو دیوار پر نظر ڈالی
الماریوں میں یہ کتابیں —
میں نے سوچا انہیں آگ لگا کر ہاتھ کیوں نہ تاپے جائیں
میر اور میراجی کو پڑھنے سے تو یہی بہتر ہے
اور میری یہ چند نظمیں۔
جو اس قابل بھی نہیں !!.....

ادھوری ملاقات

زرد بٹی روشن ہونے سے پہلے
 میں سڑک پار کر رہا تھا
 جب میں نے پہلی بار اپنے سائے کو (مخالف سمت میں جاتے ہوئے) دیکھا۔
 میرے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی
 (دیکھو میرے بائیں گال پر زخم کا ایک نشان ابھی تک موجود ہے)
 کون یقین کرے گا کہ ان چند لمحوں کے بھیس میں صدیاں گزر گئیں
 میں نے دیکھا
 زرد بٹی جلنے کو ہے
 میں نے سوچا
 اس تیز رفتار ٹریفک میں دوبارہ سڑک پار کرنے کا خطرہ کون مول لے

اسی فٹ پاتھ پر جہاں چند لمحے پہلے میں کھڑا تھا
 کچھ نیاں روشنیاں
 مجھ پر ہنس رہی تھیں !!

بمبئی کی ایک رات

شام نے ابھی چند بزار میل کی مسافت طے کی ہوگی

آوازوں کی موجیں
جوا بھی بکھری نہیں تھیں
پتھر اگئیں

سرطکوں کے دونوں جانب
خواہشوں کے کیسے کیسے بت ٹوٹے پڑے تھے

اُکا دکا جو لوگ سڑک پر چل رہے تھے
ان کا قتل

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا
جوفٹ پاتھوں پر سو رہے تھے
اُن کی آنکھوں میں مٹی کی دیواریں اُگ آئی تھیں
جن میں جڑے کانچ کے ٹکڑوں پر
اُن دیکھے خواب
نئے بچوں کی طرح رینگ رہے تھے

یہ منظر۔

عزیز کے کمرے کی کھڑکی سے صاف نظر آتا تھا
وہ اس کمرے کے فرش کے لیے
موزیک پتھر کہاں سے لاتا
یوں بھی اس کے فرش سے
شاید اسی کا لہو
فرش پر ٹپک کر
عجیب شکلیں بنا رہا تھا!!

تُو خاموش تھی

تُو خاموش تھی، لیکن میرا کمرہ

ایک سمندر آوازوں کا

تیرے ہونٹوں کے ساحل پر ایک الاؤ روشن تھا

جس کے گرد اک وحشی دُھن پر ناچ رہے تھے

میرے کمرے کی کھڑکی

یلمپ، کتابیں

میری ساری تصویریں

مَر مر کا بُت، ہاتھی دانت کی کشتی

پھر اک نرم ہوا کا جھونکا —

اور منظر نے کروٹ لی

میرے جسم کے گملے میں اظہار کا پودا

اک ٹہنی پر نطق کا پھول اپنی پلکیں جھپکاتا

بُنکھڑیوں کی اوٹ سے آنکھیں کھول رہا تھا !!

غزل

جھلک دیکھی تھی ساحل پر لپٹتے بادبانوں کی
مرے کانوں میں اب تک چاہے اگلے زمانوں کی

اُٹھائے ہیں نادیدہ عذابوں کے سیہ بادل
کہاں جاؤں ٹپکتی ہیں چھتیں ٹوٹے مکانوں کی

ہوائیں مجھ کو کیوں لے آئی ہیں صحراؤں کی جانب
مجھے ہی گھورتی کیوں ہیں یہ دوانکھیں چٹانوں کی

کہیں تیرے بدن کی خوشبوؤں سے ہی لپٹ جائے
یہ سیلِ غم جو بہتی آگ ہے آتش فشانوں کی

جزیروں کے سلسلے

جزیروں کے سلسلے —

جیسے سُرخ، گہرا، کھولتا ہوا سیاں غم

زمین کی دراڑیں ڈھونڈھ لے

جزیروں کے سلسلے —

لہو کے منجمد قطرے ہیں

پتھروں کے ٹکڑے

جو آنکھیں کھول کر مجھے دیکھتے ہیں

بہچان نہیں سکتے

جزیروں کے سلسلے —
 سمندروں کے آنسو ہیں
 جو بوڑھے گالوں سے ڈھلک کر
 سفید داڑھی میں لرز رہے ہیں

میں بھی تو بہت بوڑھا ہو گیا ہوں
 وہ ڈوبتا ہوا سورج، دیکھو۔ میں ہی ہوں
 خُدارا۔ مجھے اپنی شاموں کے منظر میں قید مت کرو
 مجھے جانے دو!!

میں اور تم

ہم خواب گاہ کی کھڑکی سے آسمان کی سمت تکتے تھے
چاند ستاروں سے
اپنے کپنے سجاتے رہے...

اب کہ ستاروں کے سیاہ پتھر ہر طرف گر رہے ہیں
آسمان کہیں نہیں
بس حدِ نگاہ ہے
اور وہ کپنے۔

جو رات کو ننھے بچوں کی طرح ہمارے بستر پر کھلتے تھے
 پو پھٹی اور ایک سفید کار اٹھیں لینے آئی
 تو تمہارے لبوں پر اپنی انگلیاں رکھ کر
 میرے رخساروں کو بوسہ دے کر
 رخصت ہو گئے

سرمایہ کی ایک بے نور صبح ہے
 میں بھی چپ ہوں
 تم بھی اُداس —
 میں کیا سوچ رہا ہوں ؟
 تم کیوں پاؤں کے ناخن سے
 مٹی کرید رہی ہو ؟ !!

۴۴ میرا دشمن

رات میں بستر پر لیٹا
تو میرا موڈ بہت خوشگوار تھا
میں جلد سو گیا
شاید میں کسی خواب کا منتظر تھا

صبح ! ابھی میں نے چائے کا پہلا گھونٹ لیا تھا
کہ کسی نے سرگوشی کی
”قم کیلئے“
”اور کم ظرف ہو“
.. نہیں... نہیں...

میں نے اپنے کان بند کر لیے

سینے میں کوئی جھانک رہا تھا
میں نے اپنا چہرہ
دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا !!

ایک نظم

تو کیا ہم صرف حالات ہیں؟

گوشت، خون اور ہڈیوں کا مرکب
اور کچھ بھی نہیں!!

میں بلیک کے سمنٹ سے ایک گھر بنا لیتا ہوں
وہ پیار سے میرے شانے پر ہاتھ رکھتی ہے
ہنستی ہے۔ کہتی ہے
”تم میرے ہی ہونا...؟“

میں کبھی زمی کھیل کر صبح کے چار بجے لوٹتا ہوں
— وہ کھانا نہیں پڑوستی

تو کیا ہم مفر اینٹ پتھر اور چونا ہیں
تاش کی ہاری ہوئی بازی
اور کچھ بھی نہیں؟!!

وہ کہتی ہے۔ "تم ذرا نہیں سوچتے"
وہ نہیں جانتی

سوچ ایک زہر ہے
اور میں یہ زہر اتنا پی چکا ہوں
کہ میرا جسم نیلا پڑ گیا ہے

میں اندھا ہو گیا ہوں
آوازوں پر جھپٹتا ہوں
”جاؤ... جاؤ...“
”جاؤ...“

ہم صرف رات ہیں
اور کچھ بھی نہیں!!

صفر

میں ایک نقطہ ہوں

اک ستارہ

جو تیری پلکوں کے آسماں پر

نہ جانے کب سے لرز رہا ہوں

میں ایک قطرہ

سمندروں کی پھرتی موجوں کی ڈور میں

جانے کتنے موتی پرو گیا ہوں
 میں ایک ذرہ
 مگر یہ دھرتی یہ چاند تارے
 میں جن کا محور بنا ہوا ہوں
 جو میری سمتوں میں بٹ گئے ہیں

میں ایک نقطہ۔ اگر میں پھیلوں
 تو دشتِ امکاں کی وسعتیں تک محیط کر لوں
 یہ سب زماں و مکاں کی دولت
 میں اپنی مٹھی میں بند کر لوں !!

غزل

نفسِ نفسِ یہ صلیبیں، قدمِ قدمِ بنِ باس
یہاں تو کوئی بھی میرا نہیں ہے، دُور۔ تہِ پاں

میں اپنے زخمِ چھپالوں کا سبز پتوں میں
مجھے نہ دے یہ تمنا کا تار تار لباس

وہ گھومتے کئی سورج مرے چراغ کے گرد
حقیقتوں کو صدا دے رہا تھا میرا قیاس

ان آئینوں میں کوئی عکس ہی نہیں میرا
یہ کس سے باندھی تھی اے ماہِ وصال میں نئے اُس

جو لمحے ساتھ گزارے سب اُس کو سوئپ دیے
عجیب رات تھی کچھ بھی نہیں تھا میرے پاس

غزل

سفر کا آخری نشان سرخ ہے
ندی، پہاڑ، آسمان سرخ ہے

مری اڑان کی عجب لکیر تھی
مرے لہو سے آسمان سرخ ہے

گنہ کے سرخ پھول ہر طرف کھلے
بدن کو سونگھتی زبان سرخ ہے

نواحِ دل میں تیرگی ہی تیرگی
نواحِ جاں میں آسمان سرخ ہے

تمہارے نام پر یہ کیا بس ایک دائرہ
ہمارے نام پر نشان سرخ ہے

نہند

یہ مٹی کی خوش بو
 مری ماں کے آنچل سہی ہے
 یہ بابا کے چہرے پہ گزرے ہوئے وقت کے کچھ نشان
 زماں و مکاں کی طرح
 مرے گرد اک دائرہ بن گئے ہیں

مری مہرباں درد کی وادیاں
 مری پمپی بیٹی کی غوغاں کے مدھم سروں سے

ڈھک گئی ہیں

سر مئی بھورے بادل

فرشس دیوار پر چل رہے ہیں

ننھی ننھی سی دوکان کی چوڑیاں

میرے چہرے پر

بالوں سے اُلجھی ہوئی ہیں

مجھے ننید سی آرہی ہے !!

غزل

کچی قبروں کے سرہانے ڈھونڈوں
زندگی، تیرے خزانے ڈھونڈوں

پھر اسی موڑ پہ تو مل جا۔
بیتی رُت، بیتے زمانے ڈھونڈوں

خواب دیکھا تھا نہ جانے کیسا
ایک تعبیر سرہانے ڈھونڈوں

تو بھی میری نہیں، میں بھی شاید
زیست کرنے کے یہاں ڈھونڈوں

ایسے دشمن کو تو پیا سا ماروں
آج میں اپنے ٹھکانے ڈھونڈوں

رقص

گجربے۔ وہ مجھے پتنگوں کے فرش پر رقص کر رہی تھی
 زمیں کے اطراف۔ چاند، وہ
 مہرے گرد دیوانہ کھومتی تھی۔
 وہ تھک گئی تھی
 وہ تھک گئی تھی

اک آئینہ ہاتھ میں لیے

مہر کی شعاعیں

وہ میرے چہرے پہ پھینکتی تھی

میں ہاتھ سے اوٹ کر رہا تھا

وہ چاہتی تھی کہ میری آنکھوں کو خیرہ کر کے ان آئینوں میں کسی طرح
مجھ کو قید کر لے

وہ چاہتی تھی کہ مجھ سے اپنا وجود بھر لے

میں اس سے دامن چھڑا رہا تھا

میں اس سے دامن چھڑا رہا تھا!!

غزل

ایک چہرہ — سراب دیکھوں گا
اک صدا — نقشِ آب دیکھوں گا

مجھ پہ احسان ایک دُنیا کا
لاؤ سارا حساب دیکھوں گا

خشک ہو جائیں گے سمندر بھی
ہر طرف جب سراب دیکھوں گا

مجھ میں بھردی ہے آگ سی کیسی
دلِ خانہ خراب — دیکھوں گا

غزل

وہ پاؤں ہی نہ رکھتا تھا کہیں پر
میں اس کا عکس تھا: بنجر زمیں پر

ابھی اک چاند کے عارض چھوئے تھے
مرے لب تھے ستاروں کی جبین پر

یہیں سب دفن ہیں میرے کھلونے
گھر وندے تُو نے ڈھائے تھے ہمارے

میں اپنے ہاتھ اٹھاتا ہوں دُعا کو
میں اپنے ہونٹ رکھ دوں گا زمیں پر

اِسی کیفے کے اک گوشے میں اب بھی
وہ شامیں روز آتی ہیں یہیں پر

غزل

کیا کروں؟ میں بھی اٹھالوں پتھر
کیوں بنایا تھا یہ شیشے کا گھر

قافلہ دیکھا تھا اک اونٹوں پر
مجھ کو یاد آنے لگا اپنا گھر

اس نے دیکھا ہے تجھے مان بھی جا
اس نے چاہا ہے تجھے فرض تو کر

صبح کے دس بجے تنہائی مری
مجھ کو لے کر چلی گھر سے دفتر

ہر خوشی اپنی ترے اک غم سے
 کیجیے تقسیم تو حاصل ہے صفر

سنسناتی ہیں ہو ایتیں کیسی
 وادی جاں میں بھی اک رات ٹہر

طائر اک شاخ پہ لوٹے سرِ شام
 چل رہا تھا میں کئی سڑکوں پر

غزل

اڑتے بچھی کی طرح تو ہوتا
میں کسی دشت میں آہو ہوتا

لکڑا ہوا تو آوارہ
میں کہیں رنگ کہیں بو ہوتا

وادیاں گونجتی رہتیں تجھ سے
میری آواز اگر تو ہوتا

ذرہ ذرہ مری لاکھوں آنکھیں
لمحہ لمحہ ترا جا دو ہوتا

نہیں آجاتی اگر چین مجھے
کسی کروٹ، کسی پہلو ہوتا

وہ اگر لاش نہیں تھی میری
تو اُن آنکھوں میں اک آئسو ہوتا

غزل

آنکھیں بند ہیں اور لب ساکت، کونے میں جو بیٹھا ہے
اس نے میرے باتیں کی ہیں، میرا جی کو دیکھا ہے

چڑھتے سورج کی گرمی میں، تیرا سارا میک آپ گھلا
میں لفظوں کی چھاؤں میں بیٹھوں میرا عشق بھی جھوٹا ہے

اُو، بھر کی کالی راتیں اُس کے ذکر سے روشن کر لیں
اُو اُس کی بات کریں ہم۔ تم نے چاند کو دیکھا ہے؟

بچپن کی دہلیز پہ میرا سارا جیون بیت گیا
ایک ہی لفظ تھا اک تختی پر، میں نے جس کو لکھا ہے

اس کی آنکھیں نم ہیں مصحفِ تم بھی اور اُداس ہوئے
اُن باتوں کو بھول ہی جاؤ۔ اُن میں اب کیا رکھا ہے

آئینہ اور دیواریں

کبھی دھوپ میں ننگے پاؤں اُسے ریگ ساحل پہ دیکھوں
 کبھی تنگے پتھروں کے جھرمٹ میں
 کبھی ماں سے باتوں میں مصروف۔ سر کو دوپٹے سے ڈھانکے ہوئے
 کبھی دیکھوں حدِ نظر تک اُسے آسماں کو زمیں سے ملاتے ہوئے
 کبھی اک کچھ کچھ بھری نَفس میں جلتے ہوئے۔

ابھی میرے اشکوں سے جب آسماں، چاند تارے زمیں
 سب آئینے دھل جائیں گے
 رات ڈھل جائے گی

وہ آئے گی اور میرے پہلو میں سو جائے گی
 صبح۔ میرے سر ہانے تپائی پہ رکھی ہوئی چائے کی ایک پیالی
 کاغذ کی چوڑیوں، باسی پھولوں سے مہنس مہنس کے باتیں کرے گی!!

شب بیلدا

عجیب رات تھی

روشنی کی اک دراڑ میرا جسم پیر کر
 شکن شکن مرا لباس، ننید کی ردِ آپلنگ، کرسیاں
 خواب گہہ کے فرش کو دو نیم کر گئی
 میں تیری روشنی میں سرسرنہا گیا

مرے خدا

میں آگیا...

عجیب صبح تھی

ہزار زائرین جمع تھے مرے مزار پر
 وہ اپنی اپنی آرزوؤں، حسرتوں کی چادریں لیے
 عقیدتوں کے پھول مجھ پہ پھینکتے ہوئے
 وہ تجھ سے بھیک مانگتے رہے مرے دیار پر
 وہ لوگ جو تری اُنا کا جادہ تھے
 وہ لوگ کتنے سادہ تھے

میں چُپ رہا —

تو کیا یہی مری تمام عمر کی کمائی تھی
 یہی تھا اے خدا
 مرے وجود کا صلہ !!

غزل

دیکھو گھروں کی تیرگی سڑکوں پہ آگئی
سائے ہمارے بڑھنے لگے۔ پھیلنے لگے

اچھا۔ تمہیں بھی چاندستاروں کا موہ تھا
کیوں؟ روشنی کی ایک کرن کو ترس گئے؟

تکیے کو آنسوؤں سے بھگویا نہیں کبھی
اس سے جدا ہوئے ہیں تو ہنس کر جدا ہوئے

یادوں کو میری برف میں کب تک رکھے گی تو
اب نام کو بھی میرے کہیں دفن کر بھی دے

غزل

(محمد علوی کے نام)

رُت جانی پہچانی بھیج
زخموں کی حیرانی بھیج

باسی کلیوں میں لیٹی
اک تصویر پرانی بھیج

دل میں سناٹا بھر دے
آنکھوں میں ویرانی بھیج

لامسِ پرا بچپن لوٹا
میرا عہدِ جوانی بھیج

وہی پرانی باتیں خط میں
کوئی اور کہانی بھیج

بھاری پتھر

اِس بستی میں ایک گلی ہے
 جس کے بُنگرے پر اک گھر ہے
 اُس گھر میں کیوں آتا ہوں
 اک دفتر کیوں جاتا ہوں
 ایک سڑک پر جس کا کوئی انت نہیں ہے
 چلتے چلتے تھک جاتا ہوں

آئیے میں

اک مرد کا چہرہ ہنستا ہے

اک عورت اس مرد سے جاتے کیا کہتی ہے
 ننھی نیلو متھیں انگوٹھالے کراں کی باتیں
 کیسے غور سے سنتی ہے

کیسی تھکن مجھ پر طاری ہے۔ پلکیں بند ہوئی جاتی ہیں
 دن کی ریت۔ مری سٹھی سے

ذرہ ذرہ

لمحہ لمحہ

گرتی ہے

اک بھاری پتھر سر کا کر

اپنے سر ہانے آتا ہوں

ہاتھوں کی بے سمت لکیریں

پاؤں کے چھالے۔ زنجیریں

تکیے کے نیچے رکھ کر

سو جاتا ہوں !!

غزل

دیکھا ساتھ تو کوئی شکایت نہیں رہی
کب میرے دل میں تیری محبت نہیں رہی

اک عمر ہو گئی مجھے خود سے ملے ہوئے
جیسے مجھے اب اپنی ضرورت نہیں رہی

اب اُن بُتوں کے نام بھی آنکھوں میں دفن ہیں
اب لوحِ دل پہ کوئی عبارت نہیں رہی

مجھ میں ہی کھوٹ تھا جو نہ سر کو جھکا سکا
قدموں میں ورنہ کون سی دولت نہیں رہی

اے عمرِ رفتہ ! اب مری زنجیر کھول دے
میں تھک گیا ہوں پاؤں میں طاقت نہیں رہی

غزل

تو اپنے اشکوں کے سارے گھر مجھے دے دے
پہ پلکیں چوم لوں، یہ چشمِ تر مجھے دے دے

یہ کیسی پیاس ہے کانٹے اگا رہی ہے کیوں
یہ کیسا زہر ہے، یہ زہر اگر مجھے دے دے

جو مجھ کو بھول کے خوش ہیں وہ لوگ کیسے ہیں
میں ان کو دیکھوں کوئی بال و پر مجھے دے دے

یہ اپنے چاند ستارے تو اپنے پاس ہی رکھ
بس اک چراغ کی لورات بھر مجھے دے دے

پھر اس کی خاک سجالوں میں اپنے ماتھے پر
وہ میرا شہر، وہ گلیاں وہ گھر مجھے دے دے

غزل

دروازے تک آئیں
لوگ مجھے سمجھائیں

اُس سے مل کر دیکھیں
اپنا نام بتائیں

میرا ایک ہی محور
اُس کی چار دِشائیں

دھرتی کے لبِ کانپے
ہم بھی ہاتھ اٹھائیں

میرے لوٹ آنے کی
مانگیں سب نے دعائیں

دفتر بھی جاتا ہے
یا دوں کو سمجھائیں

پنچھی لوٹے۔ ہم بھی
شام ہوئی گھر جائیں

بچو ! باہر کھیلو
مصحف جاگ نہ جائیں

واپسی

چہروں کی اس بھیر میں

اپنے چہرے کا

بازو تھاموں

کچھ بولوں تو۔

لفظ کسی بس کے نیچے آجائیں گے

سجی ہوئی دو کانوں پر
اک بے جاں گڑیا کی آنکھوں میں کھوجائیں گے

شہر میں رہتے رہتے —

ڈرتا ہوں اک دن ایسا سورج نکلے
اپنے کو پہچان نہ پاؤں
اک صحرا میں۔ اک پر بت کے نیچے
اک اُبڑے مندر میں

شو کی مورت پر پھول چڑھاؤں
اک برگد کے نیچے بیٹھوں

ہاتھ اپنی جھولی میں ڈالوں
بیتل کی ڈیریا میں

میری سولی ہوئی آواز

اک بیڑیا میں

دو جاگتی آنکھیں

اک رومال کی تہہ سے

اپنے خدو خال نکالوں!!

وہ لوگ

تم کو
سانس بھی لینے پر ٹوکا کرتے تھے
میں آؤں تو مجھ کو
دروازے پر روکا کرتے تھے

ہونٹ ہلانے سے پہلے
آوازوں کا رخ
بہتی ہوا میں دیکھنے والے
رونے اور ہنسنے سے پہلے
دائیں بائیں دیکھنے والے

میں نے تو اُن لوگوں سے کب کا ناٹھ توڑ لیا ہے
اچھا ہے۔ تم نے بھی اُن کو اپنا کہنا چھوڑ دیا ہے!!

غزل

دھیان تیرا - من تیرا
لب پہ ہے سخن تیرا

دیکھ لوں - ترا جہرا
سوچ لوں بدن تیرا

ذرّہ ذرّہ میں بکھروں
شہر تیرے، بن تیرا

دل میں ایک تیرا غم
چاند میں گہن تیرا

لے - یہ مشّتِ خاکِ فن
لے - یہ سارا دھن تیرا

غزل

تجھ کو شہر میں۔ بن میں ڈھونڈا ہار گئے
اک جنگ دیکھائسات سمندر پار گئے

سینے پر اک بوجھ سالے کر لوٹ آئے
اُس سے ملنے اُس کے گھر بے کار گئے

اک جینے کی رسم نبھائی ہے سب نے
ہم دفتر سے گھر آئے، بازار گئے

جانے جی میں کیا آئی اور کیا سوچا
اک بازی جو جیت ہی لی تھی ہار گئے

غرِبت میں کیوں یادِ وطن ساتھ آئی ہے
دشت میں لے کر گھر کی اک دیوار گئے

ایک نظم

وہ جو اک حساب کی تھی گھڑی
وہ گھڑی تو بے کی گزر گئی

وہ جو درد تھا ترے بحر کا
جو مہک رہا ہے ہواؤں میں
وہ جو چاند تھا ترے وصل کا
جو مرے بدن کی گپھاؤں میں

مری روح تک میں اُتر گیا
 وہ جمال تھا — تری آنکھ کا
 کہ ان آنسوؤں کی نمی تھی وہ
 کہ رگِ گلو کا تھا وہ لہو
 وہ جو آبرِ آبرِ برس گیا
 مرا زخم زخم نہا گیا
 مری کشتِ جاں بھی ہری ہوئی

وہ جو اک حساب کی تھی گھڑی
 وہ گھڑی تو کب کی گزر گئی!!

غزل

ہر آئینے میں خدو خال اُس کے
سیہ آنکھیں، سنہرے بال اُس کے

کہاں جاتا، زمیں پر شہر و صحرا
سمندر میں بچے تھے جال اُس کے

میں قیدی جسم و جاں، کون و مکان کا
زمین، آکاش اور پاتال اُس کے

خمیدہ پشت ہوں بارِ ازل سے
مری زنجیر، نوری سال اُس کے

وہاں ہم نے بھی کل مصحف کو دیکھا
اڑی رنگت، پریشانِ یال اُس کے

تخلیق

انگلیوں میں لہو کی کچھ بوتلیں
 ان سہ بادلوں کے کاغذ پر
 قطرہ قطرہ گر اسکا نام لکھیں
 اور برکھا کچھ اس طرح برسے
 وادیوں، ساحلوں سمندر پر
 جگمگاتے ہوئے دیوں کی طرح
 ہر طرف اس کے عکس اتر جائیں!

پُل۔ نیچے

جانے کتنی صدیوں سے
 سورج سے مُنہ پھیرے
 میں اک آنکھ سے سوتا تھا
 اور اک آنکھ سے جاگ رہا تھا
 اک محور پر۔ اپنے آگے
 اپنے پیچھے بھاگ رہا تھا

آج کوئی بوڑھے ہاتھوں سے
 میری تھکی ہلکوں پر
 شبِ نیم کی چادر رکھے گا
 میری لاش لیے کشتی پر
 پُل کے نیچے سے گزرے گا!!

غزل

دُکھ کو گلے کا ہار بیتا یا، کس نے... تم نے
چاہت کا یہ روگ لگایا کس نے... تم نے

میں نے اپنی بات کہی تو ہنس کر بولے
افسانہ یہ خوب سنایا کس نے...؟ تم نے؟

میری آنکھوں کے دروازے پر دستک دی
سوئے ہوئے اک غم کو جگایا کس نے...؟ تم نے

نیند کے گھر میں خوابوں کی پریاں اُتریں
تاروں سا آنچل لہرایا کس نے...؟ تم نے

شہرت کی پیوند لگی چادر پھیلا کر
لفظوں کا بازار سجایا کس نے...؟ تم نے

دستکش

رات کھٹکھٹاتی ہے
 میرے گھر کا دروازہ
 ہر طرف ہوا جیسے
 سسکیوں کے لہجے میں
 لے رہی ہے میرا نام
 پوچھتی ہیں خوشبوئیں
 راز کیوں مرے غم کا
 چاند گھومتا ہوگا

ایک ہی زمیں کے گرد
 اس سے کیا علاقہ ہے
 میری خاک میں ملتی
 در بدر جوانی کا
 توتر کر چٹانوں کو
 گراہل پڑے چشمہ
 اس سے کیا علاقہ ہے
 میری سرخ آنکھوں میں
 ایک بوند پانی کا

سرد ہوائیں پالیں گی
 خون کی مہک لیکن
 اب بھی میرے چہرے پر
 کچھ پرانے زخموں کا
 اک نشان ہے تازہ
 رات کھٹکھٹاتی ہے
 میرے گھر کا دروازہ!!

بیروت

دھرتی نے سارے دکھ چپ چاپ سہے
اپنے سینے کی آگ کو گلشن
تنہائی کو
صحرا میں تجسیم کیا
سیلِ اشک کو قطرہ قطرہ
چشمہ، جھرنا، ندی، دریا
ساگر میں تقسیم کیا

آج نہ جانے دھرتی پر کیا بیہوشی
جیسے سینے کا آہن بگھلا
سرخ اُبلتا لاوا جیسے پلکوں کی سلاخیں
توڑ کے باہر نکلا
آنکھوں کے آنگن میں
ماتم کا شور اُٹھا!!

غزل

اپنے گھر میں بیٹھا ہوں
ہر اتوار کو آتا ہوں

اک ساحل کی آس لیے
ایک ہی لہر پہ بہتا ہوں

تو نے اتنی دیر میں جانا
غیر نہیں ہوں اپنا ہوں

چوم لے میری بھینگی پلکیں
رخصت ہوتا لمحہ ہوں

باسی پھول کی خوشبو ہوں
بیتی رت کا جھونکا ہوں

لوگ مجھے حیرت سے دیکھیں
 تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہوں

بلکیں نریندے بوجھل ہیں
 میں صدیوں کا "۱۷"

شاد و تمکنت کی یادیں

زمین کو کچھ اس طرح اُلٹا گھمائیں
 کہ سب گردشیں وقت کی ایک پل کو ٹھہر جائیں
 بس ایک پل کے لیے —
 اُسی موڑ پر تو دوبارہ ملے
 اُن ہی رستورانوں میں بیٹھیں۔ اُسی میز پر تجھ سے نظمیں سنیں
 اُن ہی راستوں پر چلیں
 کہ جو گھر کی چوکھٹ پہ یوں ختم ہوں۔ دن نکلنے لگے
 بس اک پل کے قدموں کی مانوس آہٹ ہو

اور رات سینے میں ڈھلنے لگے

مگر ایک پل۔ وقت کے آسماں پر

عجب کہکشاں بنے کبھی میں نے سوچا نہ تھا

اک آنسو۔ اس آئینے میں تیرا چہرہ

کبھی میں نے دیکھا نہ تھا

ابھی تیری آواز کا بیج دھرتی میر

ابھی تیرے چہرے کو مٹی سے دھ

تو چمکے خد و خال تیرے

عناصر کی تہذیب میں

ستاروں کی ترتیب میں۔

اے مری شبِ رفتہ

اے مری شبِ رفتہ - رفتہ
 تو بچھڑ گئی مجھ سے
 اور پاس اتنی تو
 جیسے دل کی ویرانی
 جیسے آنکھ میں آنسو
 تجھ کو اس طرح دیکھا

جیسے چل رہا ہوں میں
 مدرسے کی راہوں میں
 جیسے سو رہی ہو۔۔۔ وہ

اب بھی میری باہنوں میں
 تجھ کو اس طرح دیکھا
 خواب اک جوانی کا
 اور نیند کے پہرے

تجھ کو اس طرح پایا
 جیسے دل میں شک ٹہرے
 تجھ کو اس طرح کھویا
 جیسے تو بدن میں ہو
 اور بدن کے سوجھرے

اے مری شبِ رفتہ
 صبح کی سپیدی سی
 سقف و بام و در پر ہے
 آنکھ کے مکانون میں

تو کہاں گئی - جانے
 کھ گئے زمانوں میں
 چاپ تیرے قدموں کی
 بجھ رہی ہے کانوں میں
 تیرا آخری منظر

منزلِ سفر میں
 گردِ رہ گزر میں ہے!!

ایہ نظم

سانجھ ہوئی

نیلے آکاش پہ اڑتے پنچھی

پیرٹروں کی شاخوں پہ لوٹے

میں بھی اس انجانے شہر کی بھیڑ سے ہٹ کر

سڑکوں کے اس پھیلے یکھڑے جال سے کٹ کر

اپنے گاؤں کی گاڑی میں بیٹھوں

لوٹاڑ ڈبے کی کھڑکی سے

اپنے گھر کا آنگن

اپنی گلی کا منظر سوچوں

بابا کے ہونٹوں کی دیوار پہ

اپنے نام کا سایہ دیکھوں

اپنا چہرہ یاد نہ آئے

اپنے خال و خد

ماں سے پوچھوں

شاید میرے عہدِ گزشتہ کی بوسیدہ

پامال کتابوں میں کوئی

ایسی تحریر ہو۔ ایسا لفظ ہو

حرف کوئی

جو گہری ننید سے آنکھیں ملتا اٹھ جائے

میری کالی اچکن، بالوں والی ٹوپی پہنے

مجھ کو لینے

اسٹیشن پر آئے!!

غزل

نقشِ پامر
راستہ کسر

ایک دل تہ
ایک جاں

ایک غم کی ہوا
ایک رنگ

دل نے اب
آنکھ صدیوں

میری تصویراً
عکس آئینے

تاریک ستارہ

تو نہ چاہے تو یہ ممکن ہی نہیں
 میں کبھی تیری تمنا بھی کروں
 اس طرح خود سے بچھڑ جاؤں میں
 کسی زنجیر کے نغمے میں
 کسی سائے کی سرگوشی میں
 اپنی پلکوں پہ لرزتے ہوئے اک آنسو میں
 تجھے دیکھوں بھی تو یہ پہچان نہیں پاؤں میں
 اس طرح خود سے بچھڑ جاؤں میں

اس قدر دُور چلا جاؤں میں —
 اس قدر دُور کہ جی گھرائے
 اس قدر دُور۔ زمیں گھٹے ہوئے دائروں میں

ایک موہوم ساقطہ بن جائے
 اس قدر دُور کہ یہ رات کا سارا منظر
 ایک تاریک ستارہ بن جائے
 اور تری آنکھ کی آنکھوں بھری تنہائی میں
 آسمانوں کا دھواں رہ جائے
 اس قدر دور چلا جاؤں میں —

زرد پتوں کی طرح —

رات کی شاخ سے لٹے ہوئے کچھ خواب مرے
 سرد تاریک ہواؤں میں انہیں بہنے دو
 یہ خدو خال مرے

اپنی بیچان کو ترسے ہیں بہت
 اور کچھ دیر مرے

عکس کا زخیم انہیں سمجھنے دو

شور کیسا ہے یہ خاموشی کا

میری آواز کا ماتم ہے کہیں

میری آنکھوں پہ یہ مٹی کی تہیں — رہنے دو!!

فساد

یہ آگ ہے صحرا کی
 لیکن یہ دُھواں کیا ہے
 اس آگ کے ہاتھوں پر
 انسانوں کے سر کیسے؟
 اس آگ کے قدموں میں
 یہ راکھ کے گھر کیسے؟
 یہ نیم دوکاں کیا ہے
 صحرا میں کھنڈر کیسے؟

یہ آگ ہے صحرا کی
 وہ پیچ مگر کیا تھی؟
 یہ کیسی صدائیں ہیں
 ان ناچتے شعلوں میں
 بچوں کے کھلنے ہر،
 ماؤں،

بہتے

انسا

پٹروا

کھیل

چاہت کے پیچھے بھاگے۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہوئے
 شہرت کے پیچھے بھاگے۔ اپنی بنائی دیواروں میں محصور ہوئے
 دولت کے پیچھے بھاگے۔ اپنے گھر سے دور ہوئے

شہرت ، دولت ، چاہت تینوں ہاتھ نہ آئیں
 تین ہیولے ساتھ ہیں لیکن ایک تمہاری پرچھائیں
 ناٹ کر کٹ میچ میں جیسے ایک ہی شخص کے سائے چار
 دیکھو اس کے اور تمہارے بیچ یہ ٹی۔ وی کی دیوار
 کیسے جتن سے وہ وکٹوں پر دوڑے سوسو بار
 تم بھی اپنی سانسیں جوڑو۔ دفتر، گھر، بازار!!

غزل

قفس میں جی نہیں لگتا تو یہ بھی کر دیکھے
ہوا کا گیت سنے، رقصِ بال و پردیکھے

میں گونجتا ہوا لاوا ہوں وہ اگر سن لے
میں کب سے گنگ ہوں پتھر ہوں وہ اگر دیکھے

زمین پہ میرے سوالوں نے آنکھ جب کھولی
معافی کا سہ بکف، لفظ در بدر دیکھے

نشانِ وقت کے کوڑوں کے میری پیٹھ پہ ہیں
کوئی قمیص کے بٹنوں کو کھول کر دیکھے

کہیں بھی پڑ رہے اک رات کا قیام ہی کیا
وہ چاہتی ہے کہ چھوٹا سا ایک گھر دیکھے

نیم دائرہ

تجھ سے کتنی دور ہوئے ہم

ہونٹوں کے ساحل پر

بہکے قدموں — چلتی

باتیں

خوابوں سے — روشن

راتیں

بیتے دن — بیتی سانسوں جیسے

بند صحیفوں کے اوراق الٹاتی

تیز ہوا کی

گھاتیں

ریل کی پٹری کے سُر
 نیم دائرے — پیچھے جاتے پیڑوں کے ٹوٹے
 نگر، صحرا، بجلی — ٹیلیفون کے کھمبے
 تیرے دھیان کی دُور — نہ چھوٹے

کوئی نہ جانے —

اک پل — یا اک جیون بیتا
 مٹی بکھری شاخ سے پتا لٹا!!

بے نام

ہم جس کے لیے راتوں کو جاگا کرتے تھے
 جب اُس سے بات نہیں ہوتی تھی
 (یا چاند کہیں بادل میں چھپ جاتا)
 جب صبح کوئی پیغام نہیں لاتی تھی
 کیوں شام تلک بستر سے نہیں اٹھتے تھے
 ہم شیو نہیں کرتے تھے

جب دونوں وقت ملے
 کیوں ہم نے دعا کو ہاتھ اٹھائے
 اپنے ہی اشکوں کی بارش میں بھیکے
 مٹی کی صورت —
 یوں وقت کے چاک پہ گھومے
 پھر کوئی چہرہ یاد نہ آیا
 لو۔ اپنا نام بھی بھولے!!

غزل

وہ تری ہمسائیگی تھی میں نہ تھا
اک ندی تھی تشنگی تھی میں نہ تھا

میں نے تجھ کو چھو کے دیکھا تو نہ تھی
جانے تو کیا کہہ رہی تھی میں نہ تھا

تو نہیں تھی حسن کا سایہ تھا وہ
آنکھ کی دیوار سی تھی میں نہ تھا

رات۔۔ بے بس رات بستر پر مے
کر ڈیں لیتی رہی تھی میں نہ تھا

لے گئی مجھ کو کہاں شامِ فراق
وصل کی شب آگئی تھی میں نہ تھا

اگ سی اک اگ تھی میرا وجود
 روشنی ہی روشنی تھی میں نہ تھا

آئینے میں ہنس رہا تھا میرا عکس
 میز پر تصویر بھی تھی، میں نہ تھا

غزل

اسکوڑ پر جاتے ہو
رات گئے گھر آتے ہو

خود سے کم کم ملتے ہو
لوگوں سے کستراتے ہو

یادوں کی انگلی تھامے
کس سے ملنے جاتے ہو

جاؤں، دور ہی سے دیکھوں
پاس آ کر کھو جاتے ہو

سامنے دیکھو، اپنے ہی
سائے سے ٹھوکر کھاتے ہو

صدیاں گزری جاتی ہیں
کتنی دیر لگا — تے ہو

جھوٹی باتیں کرتے ہو
میرا دل بہلاتے ہو

گھر پر بے شک یاد آؤ،
دفتر میں کیوں آتے ہو

میرے لہو میں — دیکھو تو
کتنا شور مچاتے ہو

اپنے آنسو تو پونچھو
مصحف کو سمجھاتے ہو